© rasailojaraid.com

انگریز اور انگریزی کے مدح خواں

اوریا مقبول جان

انگریز اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے مداح شاید اب بھی اسی خواب میں گم ہیں کہ اس ملک میں ہزاروں پرائیویٹ اسکولوں کی ایک نرسری قائم ہونے کے بعد یہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس خطے میں بے مثل انتظامی آفیسر، بہترین سائنس دان اور عظیم دانشور پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے، ہمیں اس بارے میں سول سروس کے بدترین نتائج کو غور سے دیکھ لینا چاہئے اور پھر ان گیارہ ہزار چار سو چھ امیدواروں کے اسکولوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے غور کرنا چاہئے کہ ہم نے اس قوم کو کس دلدل میں پھنسا دیا ہے، یہ نتائج سول سروس کی تاریخ کے بدترین نتائج ہیں، صرف دو فیصد امیدوار یہ امتحان پاس کر سکے، اس امتحان میں بیٹھنے والے سب امیدواروں کے والدین نے روکھی سوکھی کھا کر انہیں برساتی کھمبیوں کی طرح پھیلے انگلش میڈیم اسکولوں میں داخل کرایا، یہیں سے وہ اے اور او لیول میں نمایاں نمبر لے کر ان کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گئے، جو مروجہ نظام تعلیم سے مختلف اور خود کو آکسفورڈ کیمبرج اور ہارورڈ کی روایت کی وارث اور امین سمجھتی ہیں، ان کے والدین نے ان پر لاکھوں روپے فیسوں اور دیگر اخراجات کے طور پر خرچ کیے، آج سے پندرہ بیس سال قبل اس ملک میں شاید ہی کوئی ایک ایسا ادارہ موجود ہوتا ہوگا، جو سول سروس کے امتحان کے لئے خصوصی تعلیم کا بندوبست کرتا ہو، لیکن آج ہر بڑے چھوٹے شہر میں ایسے اداروں اور اکیڈمیوں میں ہر مضمون کا ایک ماہر، طالب علموں کو سول سروس کے امتحان کی تیاری کراتا ہے، بہت سے ریٹائرڈ سول سرونٹ امتحان میں کامیابی کے گر بتاتے ہیں، یہ سلسلہ گزشتہ پندرہ سالوں سے جاری ہے، لیکن ان اداروں میں اب جو نسل داخلہ لے رہی ہے یا ان امتحانات میں جو لوگ ہر سال جوق در جوق شریک ہوتے ہیں، ان کی بنیادی تعلیم اب ایک ایسی زبان میں ہونے لگی ہے جو ان کی تعلیمی استعداد کو شدید متاثر کر رہی ہے۔ تمام درسگاہیں اور ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ کسی غیر ملکی زبان میں علم کی ترسیل اور اس کو سمجھنے کی صلاحیت تیس فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی، اس کے بعد اس زبان میں اظہار کرنے، لکھنے یا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بولنے کی صلاحیت اور کم ہو جاتی ہے، اس لئے جب بھی کوئی فرد انگریزی زبان میں مضمون پڑھتا ہے تو دوسرے کو سمجھانے کے لئے اور اس کا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے اردو، پنجابی، پشتون، سندھی، بلوچی کا استعمال کرتا ہے، تاکہ بات اگلے کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے، ہمارے گزشتہ ایک سو سال کے نظام تعلیم کی یہی ایک خوبی تھی کہ لولا لنگڑا سہی، تکیہ، اپنی زبان پر ہی کیا جاتا تھا اور ایک عام سا استاد بھی بچپن میں یہ بات اپنے شاگردوں کے ذہن میں بٹھا دیتا تھا، پھر کسی حد تک اہم معاشرتی مضامین اردو میں ہوتے تھے، جن کی وجہ سے طالب علم کو تاریخ اور حالاتِ حاضرہ سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہوتی تھی اور وہ عام سے انگریزی مضمون کو بھی ایک دوسرے سے بحث مباحثے کے بعد اچھی طرح ذہن میں اتار سکتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اس کے بچپن سے لے کر جوانی تک قصوں، کہانیوں اور دیگر معلومات کا ماخذ اس کی اپنی زبان ہوتی تھی، اس دماغ کی اسکرین پر جو دنیا آباد ہوتی، وہ اسے اپنے حوالے سے پوری دنیا کو سمجھنے میں مدد دیتی، یوں اس ذہن کی صلاحیتیں بھی کھل کر سامنے آتیں اور وہ ایک ایسا شخص بن کر نکلتا، جسے بیک وقت دو یا تین زبانوں کو سمجھنے کا ملکہ حاصل ہوتا، اپنی مادری زبان، قومی زبان اردو میں اس کے اجتماعی لاشعور نے وہ سارے تلازمے اور لفظ اکٹھے کئے ہوتے اور پھر انگریزی، لیکن اب موجودہ نظام تعلیم نے اسے جب سے انگریزی تک محدود کیا ہے، وہ غبی بن کر رہ گیا ہے اور (انگریزی کے طفیل) اس کی ساری تخلیقی صلاحیتیں تباہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

دلیل دی جاتی ہے کہ اس سے تعلیم بہتر ہوگی، ان لوگوں کو شاید علم نہیں کہ ایک انگریز بچہ اسکول کے علاوہ باقی پندرہ بیس گھنٹے گھر اور محلے میں ہزاروں ایسے محاورے، قصے، کہانیاں اور تبصرے انگریزی زبان میں سنتا ہے جو اس کی یادداشت اور ذہانت کا حصہ بن جاتی ہیں اور اس کا ذہن دن بدن وسعت اختیار کرتا جاتا ہے، پاکستان میں، جب بچہ اسکول سے باہر آتا ہے تو پھر وہ انگریزی کو خیر باد کہہ دیتا ہے، محلے میں، گھر، دکان اور ہوٹل پر وہ روزمرہ، محاورے، کہانیاں، ضرب الامثال، غصے کے اظہار میں گالیاں، دکان یا ہوٹل پر لین دین اور ریڈیو، ٹیلی ویژن پر تبصرے سب اردو یا مقامی زبان میں کہہ سن رہا ہوتا ہے، یوں یہ ایک بیگانے ماحول میں پروان چڑھتا ہے جس کا اس کی تعلیمی صلاحیت بڑھانے میں کوئی حصہ نہیں ہوتا، نہ اس کا محاورہ بہتر ہوتا ہے اور نہ ہی زبان، نہ اس کی قوت استدلال یا بیان کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے علمی تناظر میں وسعت آتی ہے، اسکول معاشرے سے اجنبی اور معاشرہ اسکول سے اجنبی ہے، یہ ہے ہمارا المیہ، جس کی وجہ سے آج سول سروس کے امتحانات میں ہم دو فیصد نتائج حاصل کرنے کا ''تمغہ امتیاز'' سینے پر سجائے ہوئے ہیں، میں اس فقرے کو ایک بار پھر دہرانا چاہوں گا جسے میں نے بارہا دہرایا ہے کہ دنیا کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں جس نے کسی دوسرے کی زبان میں علم حاصل کیا ہو اور پھر ترقی بھی کی ہو، اس لئے آپ کسی دوسرے کی زبان میں علم سکھا تو سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زبان میں تخلیقی صلاحیتیں مردہ ہو جاتی ہیں۔

ان پانچ ہزار سالوں میں دو ملکوں، بھارت اور سنگاپور نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی حماقت کی، سنگاپور گزشتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پانچ سال سے سرتوڑ کوشش میں ہے کہ واپس کیسے آیا جائے اور بھارت میں اب تمام پالیسی ساز اداروں نے گھنٹی بجادی ہے، وہ کہتے ہیں کہ بھارت سائنس کے میدان میں نقلچی بن کر ابھر رہا ہے، ہر سال 22 کروڑ بچے اسکول میں داخل ہوتے ہیں اور 40 لاکھ سے بھی کم گریجویٹ بن پاتے ہیں، دنیا میں جن ممالک میں سو فیصد شرح خواندگی ہے، وہ سب کے سب اپنی قومی زبان میں تعلیم دیتے ہیں، گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل لائیٹنر نے پنجاب کی تعلیمی حالت پر تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل رپورٹ لکھی، اس کا لب لباب یہ ہے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے یہاں سو فیصد شرح خواندگی تھی اور یہی حال سندھ اور خیبر پختونخوا کا تھا، لیکن انگریز کے جانے تک ہماری شرح خواندگی گر کر گیارہ فیصد تک آ گئی تھی، انگریز اور انگریزی کے مدح خواں اس قوم سے اور کتنا انتقام لینا چاہتے ہیں؟

☆......☆......☆

کالم نگاروں کی خدمت میں

آج کے پیشہ ور کالم نگاروں کو گزشتہ صدیوں کے درباری شاعروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں اس وقت کوئی ڈیڑھ سو کے قریب کالم روزانہ شائع ہوتے ہیں، لیکن ایسے کالم نگار گنتی کے چند ہی ہیں جو فکر و نظر کو نئے زاویے بخشتے ہوں اور جو کسی بلند مقصد کے تحت کالم نگاری کرتے ہوں......

ایک صاحب ریاست نواب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ''الہلال'' پڑھ کر اس کی امداد کی ضرورت محسوس کی، ایک چیک مولانا کے نام ارسال کیا اور ہر ماہ اتنی رقم کے تعاون کا وعدہ کیا، مولانا نے اس کا جو جواب دیا، وہ ہر لکھنے والے کے لیے قابل عبرت بھی اور باعث تقلید بھی ہے، مولانا نے اپنے مخصوص الہلالی اسلوب میں لکھا:

''اس سے میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو باادب عرض یہ کہ ان خزف ریزہ ہائے کی طلائی کی تو کیا قیمت ہے، کوہ نور اور تختِ طاؤس کی قیمت بھی جمع کر لیجیے جب بھی وہ مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے ہیچ ہے، یقین کیجیے کہ اس کو سوائے شہنشاہ حقیقی کے کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک بار خرید چکا......'' جو اخبار نویس، رئیسوں کی فیاضیوں، امیروں کے عطیوں کو قومی اعانت، قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں، وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایمان کو بے چین کریں، بہتر یہ ہے کہ وہ دیوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں......'' (داستان کہتے کہتے: ص۱۴)

© rasailojaraid.com